محمد ارشد (کامران)*

دیویندر اسّر کا تلخابہ ءحیات

Abstract: *Born in August, 14th, 1928 in Hassan Abdal, Campbelpur (now Attock, Punjab Pakistan), DevendrIssr, due to sad demise of his mother when he was only 5 years old, was brought up by his father Advocate Pandat Shiri NaathIssr. In Pleader line Campbelpur (Attock), DevenderIssr got his early education from 'AariyaSamaj School' and after matriculation got admitted in Govt. Degree College Attock. He was great admirer and true follower of his teachers like Prof. Muhammad Ajmal, Prof. Siddique Kaleem and Dr. Ghulam Jilani Barq, who not only motivated him to skillfully enter into literary world by publishing his maiden article in the 'Niswani Dunya' Lahore in 1946 but they inculcated in him successful practical and literary life skills as well. After publication of his articles in College Magazine 'Mashal' DevendrIssr, following the instructions of Prof. Ajmal, 'there is always room on top' furnished his article to 'Mahnama Saqi' and during his migration to India in1947, was astonished at Dehli Railway Station to see its publication in such a reputed journal.*

اپنے اساتذہ کے عقیدت مند دیویندر اسّر ۱۴ اگست ۱۹۲۸ء کو حسن ابدال ضلع کیمبل پور حال اٹک کے نامور وکیل پنڈت شری ناتھ اِسّر کے گھر متولد ہوئے۔ ابتدائی (پرائمری) تعلیم 'آریہ سماج سکول' کیمبل پور، میٹرک ہائی سکول کیمبل پور اور بی اے کا امتحان پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ملحق گورنمنٹ ڈگری کالج کیمبل پور سے ۱۹۴۷ء میں پاس کیا۔ دیویندر اسّر نے اپنے مولد و منشا کے بارے میں لکھا ہے کہ ”میرا جنم پنجہ صاحب میں ہوا تھا۔ میں سنا کرتا تھا: گورونانک پنجہ لایا وچ پہاڑاں دے۔“(۱) اپنی تاریخِ ولادت کے بارے میں بھی ان کا ذاتی بیان ہے ”میرا جنم ۱۴ اگست کو ہوا تھا۔ ۱۵ / ۱۴ / اگست کی رات دیش آزاد ہوا تھا۔ میری پیدائش کے ۱۹ برس بعد۔ اس لحاظ سے میں بھی اپنے آپ کو ان بچوں میں سمجھتا ہوں جن کا ذکر سلیمان رشدی نے اپنی کتاب 'مڈنائٹ چلڈرن' میں کیا تھا“ (۲)

اپنے بچپن کے بارے میں دیویندر اسّر کو جسے ماں پیار سے 'دیو' پکارا کرتی تھی، اتنا ضرور یاد تھا کہ ایک دن نوکر جب زبردستی اٹھا کر ماں کے پاس لے گیا تو وہ ماں کی چھاتی پر سر رکھتے ہی سو گیا۔ ماں بھی اس کی پیٹھ تھپتھپاتی دعائیں دیتی سو گئی لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور اپنی یادیں عمر بھر پیچھا کرنے کے لیے چھوڑ گئی۔ جب اسے ماں کی چھاتی سے زبردستی الگ کیا گیا تو یہ 'دیو' کی ماں کی گود سے عملی زندگی کی

* پی ایچ ڈی اسکالر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

جانب پہلی ہجرت تھی۔ پانچ برس کی عمر کا یہ 'دیو' ہانڈی والے لیمپ کے پاس بیٹھے ہوم ورک کے بعد سونے کے کمرے میں جاتے ہی تکیے کے نیچے رکھی پرندوں پریوں اور بھوت پریت پر مبنی کہانیوں کی کتابیں نکال کر پڑھتے ہوئے خوابوں کی دنیا میں کھو کر خیالی پرندوں کے سنگ آسمان کی سیر میں خلا میں ناچتی پریوں کی دنیا میں داخل ہو جاتا تو کبھی خلائی سیر کے دوران گلی کے اندھیروں میں سے اچانک بھوتوں کا اک غول اس پر حملہ آور ہو جاتا۔ جب کوئی گھائل پرندہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی سمت گرتا نظر آتا تو رقص کرتی پریوں کے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں چھپ جانے پر اکیلا رہ جاتا تو 'دیو' مارے خوف کے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ رات کے ڈراؤنے خوابوں کی کم خوابی کے زیر اثر صبح سویرے وہ ڈرا سہما سکول چلا جاتا۔ چونکہ سنیچر کی شام ہوم ورک سے چھٹی کے سبب اسے فلم دیکھنے کی آزادی تھی اس لیے بچپن ہی سے اسے 'نڈر ناڈیا' کی فلمیں دیکھنے کا چسکا پڑ گیا تھا۔ کبھی 'ہنٹر والی' تو کبھی 'ہری کین ہنسا' کبھی 'ڈائمنڈ کوئین' تو کبھی' جھانسی کی رانی'، الغرض 'نڈر ناڈیا' کا ہر روپ اسے پسند تھا۔

ممتا کی آغوش کے بغیر بچپن ہی سے 'دیو' کے لاشعور میں احساسِ محرومی رچ بس گیا تھا۔ ماں سے شدید محبت اور پھر احساسِ محرومی نے اس کے معصوم اور ناپختہ ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے جن سے وہ عمر بھر دامن نہ چھڑا پایا۔ فرائڈ، ایڈلر اور یونگ کے نفسیاتی فلسفے کے اس کی شعوری و لاشعوری کیفیات پر رنگ جمانے اور تخلیقی صلاحیتوں کو جِلا ملنے پر ماں سے محبت اور جدائی کے احساسات نئی صورت میں متشکل ہو کر اس کے ذہنی کرب میں مزید اضافے کا سبب بن گئے:

> ”کچھ گڑبڑ نہیں، برخوردار! ایڈیپس کمپلکس کا شکار ہو۔ مدر فکسیشن (Mother Fixation) اِن فینٹ سیکچوئیلیٹی(InfantSexuality) ان فنٹلزم سیکسوئل ازم(InfantilsmSexualism) کا شکار ہو۔ گورو دیو علاج بالکل سادہ اور آسان، ماں کو بھول جاؤ۔ اس کی ہر یاد کو، ہر عکس کو مٹا دو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“(۳)

اگر دیویندر اپنی نفسیاتی کیفیات پر قابو پانے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو بچپن کی یادوں سے پیچھا چھڑانا اس لیے بھی ناممکن اس لیے بھی تھا کہ اس صورت میں اسے اپنا بچپن قتل کرتے ہوئے ماں سے پیوستہ یادیں بھلانے کی قربانی دینی پڑتی۔ اگر وہ معصوم بچپنے سے چھٹکارا پا بھی لیتا تو ماں کی محبت اور اس کی جدائی کے نتیجے میں جنم لینے والے احساسِ محرومی سے بچ نکلنا ناممکن ہی تھا اسی لیے وہ ماں سے جڑی ہر یاد سینے سے لگائے زندگی کی منازل طے کرتا گیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ 'دیو' سے دیویندر اسّر میں ڈھلنے تلک وہ نہایت کم گو، نرم دل، دھیمے مزاج اور سادہ طبیعت کا مالک بن چکا تھا۔ غصہ اور نفرت سے اجتناب دیویندر اسّر کی فطرت کا بنیادی وصف تھا۔ ”نفرت کا تو صرف ایک ہی رنگ ہوا کرتا ہے؛ سیاہ، اور پیار کے رنگ ہزار۔“(۴) بچپن سے لڑکپن اور پھر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے تک چند دوستوں دیویندر اسّر، امن پرکاش، یدھشٹر اور شیخ محمد افضل پر مشتمل محدود سے حلقے میں اسے لیڈر کا مقام حاصل تھا۔ دیویندر اسّر کے سارے دوست تو گلی ڈنڈا، والی بال، بیڈمنٹن اور ہاکی وغیرہ کھیلا کرتے مگر وہ محض تماشائی کا کردار نبھایا کرتا تھا۔ پاجامہ قمیض میں ملبوس سادہ منش دیویندر اسّر کو

کتابوں سے شدید لگاؤ تھا۔ بچوں کا یہ گروپ ہمہ وقت اکٹھا رہتا تھا۔ گلی کے دوستوں کا اکٹھے سکول جانا، باہم مل کر ہوم ورک کرنے کے بعد فارغ اوقات میں محلے میں ہی کھیل کود کے بعد کتب بینی کی عادت، سب دوستوں کے مشاغل میں شامل تھی۔ کتابوں کا انتظام دیویندر کے ذمے تھا۔ دیویندر اسّر کی ادبی زندگی کا آغاز کالج کے زمانے سے ہی کالج میگزین 'مشعل' میں ان کے تبصرے شائع ہوتے ہی ہو گیا تھا۔ ان کی ادبی زندگی کی تشکیل میں اردو کے استاد ڈاکٹر غلام جیلانی برق، فلسفہ اور نفسیات کے استاد ڈاکٹر محمد اجمل اور انگریزی کے استاد پروفیسر صدیق کلیم نے بنیادی کردار ادا کیا۔ دیویندر اسّر کی پہلی کہانی 'چوری'، نسوانی دنیا لاہور کے اگست ۱۹۴۶ء کے شمارے میں دوسری کہانی 'ردّعمل'، 'ساقی' کے آخری شمارے جولائی۔ اگست ۱۹۴۸ء میں دلّی سے شائع ہوئی۔

دیویندر اسّر کا شمار نہ صرف کالج کے ذہین اور ادبی ذوق رکھنے والے طلبہ میں ہوتا تھا بلکہ وہ سب اسے اپنا 'گرو' مانتے تھے۔ غیر ملکی مصنفین کی کتب کے مطالعے کی کثرت کے سبب دیویندر کا رجحان بتدریج کمیونزم کی جانب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک راسخ العقیدہ کمیونسٹ بن گیا جس کا اثر قدرتی طور پر سب دوستوں پر بھی ہوا کیونکہ دیویندر اسّر روزانہ لینن اور کمیونزم سے متعلق لیکچر دینے کے بعد مطالعے کے لیے دوستوں میں لٹریچر بھی تقسیم کیا کرتا۔ بدلتے حالات کے پس منظر میں دیویندر اسّر نے بھگت سنگھ، راج گورو، سکھ دیو اور ہیمو کالانی کی شہادت سے متاثر ہو کر لڑکپن میں ہی دوستوں سے مل کر ریڈ آرمی بھی منظم کر لی تھی۔ بچپن کے دوستوں میں گذرے محبتوں بھرے پر امن ماحول کے عادی حساس طبیعت دیویندر اسّر کو سیاسی منظر نامے میں گونجنے والے نعرے بھی متاثر کرنے لگے بلکہ ان میں سے 'بٹ کے رہے گا ہندوستان، بن کے رہے گا پاکستان' اور 'ہنس کے لیا تھا پاکستان؛ لڑ کے لیں گے ہندوستان' کے نعروں کے نتیجے میں رونما ہونے والی تقسیم نے عام آدمی کی طرح دیویندر اسّر کے ذہن کو متاثر کرنے میں رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ 'ہندو، ہندی، ہندوستان: اکھنڈ بھارت امر رہے' کے نعروں کے برعکس بھارت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ''بھارت ٹوبہ ٹیک سنگھ ہو گیا۔ ایک لکیر، جو ایک نیم روشن کمرے میں لیمپ کی دھندلی روشنی میں، نیلے نقشے پر کھینچی گئی تھی دلوں کو چیرتے ہوئے نکل گئی'' (۵)

بچپن، لڑکپن اور پھر نوجوانی کے سنہری دور میں استوار ہونے والے دوستی کے رشتے چونکہ گراں قدر اور گہرے ہوا کرتے ہیں اس لیے دیویندر اسّر بھی اکثر اپنے بچپن کے دوستوں کی یاد میں تڑپتے نظر آئے۔ ''بچپن کی دوستی اک روایت بن چکی ہے مگر یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ اس دوستی میں ہی احساس کی دولت ملتی ہے۔ اس کے بعد دوستوں کی تعداد بڑھ سکتی ہے، احساس کی دولت نہیں۔'' (۶) دیویندر اسّر کی طرح ان کے بچپن کے دوست بھی ماضی کے جھروکوں سے آواز دیتے نظر آئے:

> ''میرے بیشتر دوست ہندو اور سکھ تھے، مگر سبھی خلوص و محبت کے پیکر، جن کے بارے میں یہ گمان تک نہ تھا کہ وہ سارے کے سارے اچانک اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں گے۔ حالانکہ قائداعظم کے پاکستان میں توبظاہر ہندوؤں اور سکھوں کے انخلا کی کوئی ایسی سکیم دور دور تک بھی شامل نہیں تھی، مگر فسادات کا نتیجہ تو بہر حال

پیاروں کی جدائی کی صورت میں نکلنا ہی تھا۔ دردناک جدائی کا پہلے روز کی طرح محسوس کیا جانے والا کرب یقیناً آخری سانس تک ساتھ رہے گا۔"(۷)

آپس میں دوستی کے باہمی بھروسے اور اک دوسرے پر اندھے اعتماد کی شیخ محمد افضل یہ مثال پیش کرتے ہیں :

"مجھے یاد ہے کہ دیویندر نے زندگی میں پہلی بار انڈہ کھانے کی خواہش کا اظہار کیا، جب وہ سیکنڈ ییر میں تھا۔ اس کام کے لیے باقاعدہ ایک تقریب کا اہتمام ہوا۔ وقت اور جگہ کے تعین کے بعد میرے گھر پر میرے ہی کمرے میں دروازہ بند کر کے دیویندر نے کانپتے ہاتھوں سے پہلے انڈہ چکھا اور پھر کھا لیا۔ یہ دیویندر کا ہر طرح کی جکڑ بندیوں سے پہلا انحراف تھا اور احتجاج بھی۔"(۸)

دیویندر اسّر کو زندگی کی نئی بصیرتوں کی جستجو میں سنسکار بدلنے کا اک اور تجربہ اس وقت ہوا جب تحریکِ آزادی کے سلسلے میں شمالی مغربی سرحدی صوبے (حال خیبر پختونخوا) میں بنا کچھ کھائے پیئے گھومنے کے بعد سارے دوست غروبِ آفتاب کے وقت ایک گاؤں پہنچے جہاں کے مکین شام کو روایتی ناچ گانے کے پروگرام کے ساتھ نان کباب گھریلو شراب کی کشید اور گوشت بھوننے میں مصروفِ عمل تھے۔ تاہم مذہبی تناظر میں اس اہتمام میں موجود غذاؤں میں سے دیویندر کے کھانے کے لیے صرف پانی اور نان ہی کارآمد تھے۔ میزبانوں نے جب مہمانوں کو باہم کاناپھوسی کرتے دیکھا اور جب انھیں دیویندر اسّر کے مذہبی پرہیز کے سبب گوشت نہ کھانے کے بارے میں بتایا تو ان کے چہروں کا رنگ یکسر متغیر ہو گیا اور تھوڑی ہی دیر میں آلوؤں کی تیاری کا کہہ کر واپس جانے لگے تو بقولِ دیویندر اسّر:

"دمکتے ہوئے چہرے، کسی کا دل بجھنے کا احساس۔ میرے سامنے ایک جذبے کا قتل ہو رہا تھا، یہ نہیں ہو سکتا میں نے سوچا۔ محبت کی توہین۔ میں نے دونوں طرف بیٹھے ہوئے دوستوں کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا او رہلکا سا دبا دیا وہ مسکرا دیے۔ میں نے نان کا ٹکڑا توڑا اور شوربے میں ڈبو کر کھانا شروع کر دیا آج جب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ ایک دم کیسے ہو گیا بھوک یا جادوئی منظر، سنگیت یا رقص یا دونالی بندوقیں یا جذبہ، محض جذبہ۔"(۹)

زمانہ ءطالب علمی میں لکھی پہلی کہانی کالج کے استاد پروفیسر محمد اجمل کو سناتے ہی دیویندر اسر کی ادبی پیدائش تو استاد کے تبصرے کہ 'اچھی ہے' سے ہو گئی تھی مگر ساتھ ہی گھر بلا کر اسی کہانی کو دوبارہ نئے انداز سے لکھنے کی ترغیب کے ساتھ استاد نصیحت بھی کرتے ہیں کہ دوسروں کی تقلید کی بجائے الگ انداز اپنانا زیادہ بہتر ہوتا ہے کیونکہ بڑا ادیب بننے سے الگ اور جداگانہ اسلوب کا ادیب بننا زیادہ مشکل لیکن بہتر عمل ہوتا ہے۔ دوبارہ لکھی گئی کہانی شاگرد اپنے استاد کی اس ہدایت کہ "There is always a room at top لہٰذا یہ کہانی چھپنے کے لیے 'ساقی' کو ضرور بھجوائی جائے" کی تعمیل کرتا ہے تاہم اس وقت شاگرد کے گمان بھی میں نہ تھا کہ وہ دورانِ سفر دہلی ریلوے سٹیشن کے بک سٹال پر 'ساقی' کے خاص شمارے میں چھپی اپنی پہلی کہانی دیکھ بھی لے گا۔(۱۰)

ہجرت اور کانپور میں قیام:

تقسیم کے فوراً بعد کیمبل پور کی وکلا برادری کی باہمی مشاورت سے حالات کے پرامن ہونے تک اشّر خاندان کی کانپور عارضی ہجرت کے انتظامات کیے گئے مگر حالات نے اس عارضی ہجرت کو مستقل ہجرت میں بدل ڈالا حالانکہ اشّر خاندان محض کیش جیولری اور دیگر ضروری کاغذات وغیرہ ہی ساتھ لے گیا تھا۔ دیویندر اسّر کو ماں کی گود سے پہلی ہجرت کے بعد اپنی جنم بھومی سے کانپور دوسری ہجرت کرنی پڑی۔ کانپور میں کیمبل پور کی طرح ان کے والد نے علاقہ کچہری میں پریکٹس شروع کر دی۔ اسی زمانے میں دیویندر اسّر کی ادبی تحریریں بھی متعدد رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہونے لگیں۔ ہجرت کے تلخ تجربات کے شکار حساس طبیعت دیویندر جیسے لوگ ماضی کی یادوں سے چمٹے رہنے کے سبب ناسٹلجیا کا شکار ہو کر رہ گئے:

> "تم جہاں پیدا ہوئے ہو، اس دھرتی سے، اس نگر سے، اس گاؤں سے، اس جنگل سے ہجرت کر سکتے ہو، لیکن اپنے اندر سے اس دھرتی کو، اس نگر کو، اس گاؤں کو، اس جنگل کو باہر نہیں کر سکتے۔" (۱۱)

ہجرت کے کرب کے ساتھ ساتھ نئے وطن میں شرفِ قبولیت حاصل نہ ہونا دوہرا صدمہ اس لیے بھی تھا کہ نئے وطن میں شناخت کے ثبوت مانگنے میں اک مہاجر جواب میں بطور گواہ کسے پیش کرتا؟ بے آسرا مہاجرین کے شناسا، گواہان اور درکار دستاویزی ثبوت بلکہ نام، گھر اور دیش وغیرہ سب کچھ ریکھا کے پار ہی رہ گیا تھا:

> "تمھیں داخلہ نہیں مل سکتا کیا ثبوت ہے کہ تم وہی جو تم بتا رہے ہو کہ تم نے بی اے پاس کیا ہے۔ کیا ثبوت ہے؟ کوئی کاغذ، کوئی پرچہ کوئی گواہ بھی تو نہیں تمھارے پاس" (۱۲)

الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ اور سیاسی و ادبی مشاغل:

نئے وطن میں نووارد دیویندر اسّر کے سرپر ہجرت کے مصائب کے بعد کانپور میں خاندان کی مستقل سکونت کے انتظامات کی فکر کے علاوہ اک جانب بچپن کے دوستوں سے بچھڑنے کا قلق تو دوسری جانب نئے وطن میں مستقبل کی فکر کے علاوہ تعلیمی مراحل کی تکمیل جیسے مسائل کے حل کا جنوں بھی سوار تھا مگر اس کے لیے ماضی کی روایات کا پاس رکھنے اور مستقبل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لیے فیوچرسٹک سوچ (Futuristic approach) اور جدّت (Innovation) کے اصول اپنانا بھی از بس ضروری تھا۔ ان مسائل پر قابو پانے کے لیے دیویندر اسّر نے کافی سوچ بچار کے بعد الٰہ آباد یونی ورسٹی کا انتخاب جامعہ ہذا کی فیکلٹی میں شامل پروفیسر جی کے مہتہ اور پروفیسر پی سی جین جیسی ہستیوں کے علاوہ اساتذہ کی فہرست میں شامل سویڈش اکیڈمی کے کچھ اراکین اور دیگر عالمی شہرت یافتہ مفکرین اور دانشوروں کی موجودگی کی وجہ سے کیا تھا۔ الٰہ آباد شہر اس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک اہم گڑھ تھا۔ کیمبل پور کالج کی معرفت پنجاب یونیورسٹی سے بی اے ڈگری کی عدم وصولی کی بنا پر الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلے کا دشوار تر مرحلہ 'مائی ریستوران' کے مالک' دوار کا

پانڈے' کی مدد سے طے ہونے کے بعد دیویندر اسّر کے اپنے شنا ساطالبعلم ہریش چندر چندولہ کے کمرے میں شفٹ ہونے پر وہ کمرہ 'دیویندر اسرّ کا کمرہ' کے نام سے الہ آبادیونی ورسٹی کی علمی، سیاسی و ادبی سرگرمیوں کا محور بن گیا۔ اسی کمرے سے دیویندر اسّر نے 'سٹوڈنٹ فیڈریشن' نئے زاویے سے یوں فعال کی کہ دیگر طلبا کے ہمراہ وہ انتظامیہ کی من مانیوں کے خلاف بھرپور احتجاجی جلوس نکالنے میں کامیاب ہوگئے جس کی پاداش میں حقوق کے حصول کی خاطر انھیں پہلی جیل یاترا بھی کرنا پڑی۔

الہ آبادیونیورسٹی کی علمی ادبی فضانے دیویندر اسرّ کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کیا۔"دیویندر پنجاب اور الہ آبادیونیورسٹی کے پڑھے تھے۔ پنجاب کی ہوا مٹی پانی کا اثر ان کی 'آؤ جی' کی حوصلہ افزا خیر مقدمی کلمات اور دوستی میں مترشح تھا۔ وہیں الہ آباد کے امرود کی مٹھاس اور خوشبو جیسا اپنا پن ان کی شخصیت میں تھا۔"(۱۳) بظاہر تو دیویندر اسّر نے الہ آبادیونی ورسٹی سے ایم اے اکنامکس کی ڈگری حاصل کی مگر حقیقت میں الہ آباد جیسے شہر بے مثال کے سیاسی، سماجی اور ادبی اثرات ان کی ذہنی آبیاری اور ادبی شخصیت سازی پر مثبت طور پر اثر انداز ہوکر ان کی تخلیقات پر بھی واضح نظر آنے لگے۔

کانپور واپسی اور ادبی و سماجی مشاغل:

دیویندر اسّر ۱۹۴۹ء میں ایم اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد کانپور واپس لوٹتے ہی اپنے قریبی ساتھی نند کشور وکرم کے ہمراہ انجمن اور کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں منہمک ہونے کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد خصوصاً 'امرت' کے صدارتی بورڈ اور کانپور ہی کے ماہنامے 'شعلہ' وغیرہ سے بھی عملی طور پر منسلک ہوگئے۔ اسی طرح 'قومی اخبار' اور 'سیاستِ جدید' کی اشاعت میں انھیں عملی صحافتی تجربہ بھی میسر آیا۔ کان پور میں ادبی و سیاسی سرگرمیوں میں مختلف رسائل و جرائد مثلاً 'نیو ایج' اور 'محاذ' کی تقسیم اور کامریڈ لیڈروں کی بحفاظت مطلوبہ منزل تک رسائی وغیرہ جیسے امور کی انجام دہی بھی دونوں دوستوں کے فرائض میں شامل تھی۔ دیویندر اسّر نے 'ارتقا' کے نام سے ماہنامے کا فرضی دفتر فرضی پتے اور فرضی عملے کے ساتھ اجرا کیا جس کے دوسرے پرچے کی اشاعت کی نوبت اس لیے نہ آئی کہ نئے سال کے آغاز ہی میں یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو دیویندر اسّر کی گرفتاری کے ساتھ ہی یہ اشاعت قصہ ءپارینہ بن گئی۔ پچیس روز کے بعد جب دیویندر اسّر رہا ہوکر آئے تو پولیس طلبی، ایجنسیوں کی تفتیش اور آئے دن کی چھان بین سے اکتا کر بالآخر کانپور کو خیر آباد کہتے ہوئے دہلی منتقل ہوگئے۔

دہلی میں ادبی و معاشی سرگرمیاں:

معاشیات میں ایم اے کی ڈگری کے حصول کے بعد دیویندر اسّر نے دہلی میں ایک پرائیویٹ سکول اور ایک پبلک کالج میں بھی بطور استاد ملازمت حاصل کرلی۔ دو تین کوچنگ کالجز میں تدریسی خدمات کی انجام دہی کے صلے میں جب اچھا خاصا معاوضہ ملنے سے ان کے گزر اوقات میں بتدریج بہتری آنے لگی۔ دیویندر نے سلسلہ ءملازمت اختیار کرنے کے بعد تعلیمی ضروریات کے پیشِ نظر بی ایڈ کی ڈگری

کے حصول کے لیے دہلی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ جامعہ ہذا سے ۱۹۵۳ء میں انھیں بی ایڈ کی ڈگری بھی تفویض ہوگئی۔ تعلیمی قابلیت اور پیشہ ورانہ عملی تجربات کے پیشِ نظر وزارت صحت نے اپنی زیرِ نگرانی شائع ہونے والے انگریزی رسالے کی ادارت کے لیے انھیں منتخب کرلیا جس سے ان کے معاشی حالات میں کافی سدھار آگیا مگر ساتھ ہی سرکاری ملازمت کے آڑے آنے سے ان کی سیاسی و سماجی سرگرمیاں مانند پڑنے لگیں۔ دوسری جانب انجمن ترقی پسند مصنّفین میں در آنے والی سیاست نے انھیں انجمن کی سرگرمیوں سے بیزار کردیا اور وہ جملہ سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہی ہوگئے:

"میں ہر طرح کے بند نظریات اور حکومت کی سیاست کا مخالف رہا ہوں۔ یہ فرد کو Manipulate اور Manage کرتے ہیں۔ انسان کی Manipulation چاہے سیاسی ہو، اقتصادی ہو، مذہبی یا ذاتی، میں اس کی حمایت نہیں کرتا جب کوئی تحریک اقتدار کی جنگ میں شرکت کے باعث سیاسی وابستگی کا شکار ہو جاتی ہے تو میں اسے قبول نہیں کر سکتا"(۱۴)

کلچرل فورم کا قیام:

دیویندر اسّر نے قابل قدر ادبی کارنامہ انجام دیتے ہوئے قریبی دوستوں کے تعاون سے قرول باغ میں ایک ایسے ادبی انجمن 'کلچرل فورم' کی بنیاد رکھی جس میں مختلف مکتبہء فکر کے لوگ شرکت کیا کرتے تھے جس کے سیکریٹری کے فرائض دیویندر اسّر بذات خود انجام دیا کرتے تھے۔ مصروفیات کے باوجود انھیں فراغت کے جو بھی لمحات میّسر آئے وہ انھوں نے عبث نہیں گنوائے بلکہ ذاتی تخلیقی سرگرمیوں میں وہ کامل یکسوئی سے اس طور منہمک رہے کہ اک قابلِ ذکر ادبی سرمایہ تخلیق کرلیا۔ جدید عالمی انگریزی ادب کے کثرتِ مطالعہ نے دیویندر اسّر کو وسعت النظری، جدید تنقیدی شعور اور تخلیقی بصیرت جیسے ہتھیاروں سے تو پہلے ہی سے لیس کر دیا تھا اب ان کے میلانِ طبع کا اردو پنجابی اور ہندی ادب کی جانب مبذول ہونے سے متعدد زبانوں کے ورثے کی بدولت ان کی تخلیقی اور ادبی صلاحیتوں میں مزید نکھار پیدا ہونے کا مثبت نتیجہ ان کی متعدد ادبی تخلیقات کی صورت میں کھل کر سامنے آگیا۔

شادی، ازدواجی زندگی بیرونِ ملک تعلیم:

دورانِ تدریس دیویندر اسّر کی شخصیت سے متاثرہ کئی لڑکیوں نے ان سے رومانس کا اظہار کیا مگر نہ تو وہ جھبلاٹ ندی میں جوان لڑکی کے کہے گئے الفاظ: "میری پیٹھ کو ذرا دھو دو، میل چھوٹ جائے گی۔ میرے ہاتھ نہیں پہنچتے"(۱۵) بھول پائے اور نہ ہی عمر بھر ساتھ دینے پر آمادہ 'شیلی' نامی خاتون کا اظہار محبت:

”جب تم پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگو گے تو ہولے سے تمھیں شال اوڑھا دوں گی۔ جب تم لکھتے لکھتے تھک جاؤ گے تو تمھاری میز پر گرم گرم کافی کا پیالہ رکھ دوں گی اور ہاں تمھیں سردیوں میں سانس کی شکایت ہو جاتی ہے نا! تمھاری چھاتی پر ہولے ہولے بام مل دوں گی“(١٦)

لیکن بہتر مستقبل کی خاطر انھیں 'شیلی' کی محبت ٹھکرا کر تلاش روزگار میں نکلنا پڑا۔ کالج ملازمت کے دوران 'ومل' نامی خاتون سے دیویندر اسّر کا معاشقہ بسرعت پروان چڑھنے لگا۔ پہلے 'ومل' کی تصویر ان کے کمرے میں آئی اور پھر بعد میں خاندان کی تمامتر مخالفتوں کے باوجود وہ رفیقہ حیات کے روپ میں زندگی میں شامل ہو گئی۔ شادی کے دو سال بعد وہ ایسٹ پٹیل نگر میں کرائے کے مکان میں شفٹ ہو گئے جو کرائے کے مکان سے گھر میں تبدیل ہو گیا جس میں وہ دو بچوں اور بیگم کے ہمراہ خوشگوار زندگی کے ساتھ ساتھ ادبی زندگی کی گہما گہمیوں میں یوں مصروف ہوئے کہ انھیں گزرتے وقت کا احساس ہی نہ ہو پایا۔ یوں بھی گھریلو زندگی اور ادبی مصروفیات آپس میں میل نہیں کھاتے اسی لیے دیویندر اسّر بھی ادبی زندگی کی تلاطم خیز موجوں میں ڈوبے ازدواجی زندگی میں پڑنے والی دراڑوں کا احساس ہی نہ کر پائے۔ ان کی زوجہ اپنی ریڈیو ملازمت کی مصروفیت سے گھر دیر سے آنے لگیں تو دیویندر اسّر گھر کا دروازہ نیم وا ہی چھوڑ دیا کرتے تاکہ اسے دروازے پر دستک کی زحمت بھی نہ اٹھانی پڑے لیکن یہ مثبت روّیہ بھی میاں بیوی کے درمیان حائل غلط فہمیوں کی وسیع خلیج عبور نہ کر پایا۔ اک روز جب دیویندر اسّر خود وہ گھر دیر سے لوٹے تو گھر کے بند دروازے پر دستک کے جواب میں انھیں بیگم کی چیخ سنائی دی کہ جس کے ساتھ شام گزار کر آئے ہو اسی کے پاس واپس چلے جاؤ۔ اسی چیخ و پکار کی بازگشت دیویندر اسّر کے افسانے 'مسٹر روشو' میں بھی سنائی دیتی ہے:

”مسٹر روشو نے دوبارہ دستک نہیں دی۔ یہ ان کا دستور نہیں تھا، انھوں نے ایک لمحہ اس بند درازے کو دیکھا جسے کئی راتوں کو وہ نیم وا رکھتے تھے کہ نجانے وہ کب کسی ڈرامے کی ریہرسل سے لوٹے اسے دستک نہ دینی پڑے دروازہ بند نہ ملے۔ مسٹر روشو ہولے ہولے بغیر چاپ کیے، سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ مین گیٹ کھولا اور باہر سڑک پر آ گئے۔“(١٧)

دیویندر اسّر کے بڑے بھائی مہندر ناتھ اسّر اور والد کی کانپور سے رمیش نگر منتقلی کے کچھ ہی دنوں بعد جب مہندر ناتھ اسّر کا ہسپتال میں انتقال ہو گیا تو ان کے والد کے جنک پوری میں نئے زیرِ تعمیر مکان میں آنے پر دیویندر اسّر بھی والد صاحب کے ساتھ رہنے لگے۔ والد کے انتقال پر دیویندر اسّر کی بیوی جب گھر آئی تو بہی خواہوں نے دونوں کی آپس میں صلح کروادی۔ کچھ عرصہ تو یونہی خاموشی سے گزرا مگر میاں بیوی کے درمیان تلخیوں سے باہمی لڑائی جھگڑے پھر بھی چلتے رہے۔ آئے دن کی خانگی کشمکش اور گھریلو تلخیوں سے چھٹکارہ پانے اور تسکینِ ذہن و قلب کے لیے دیویندر اسّر نے اپنی تمام تر توانائیوں کا رخ تصنیف و تالیف کی جانب موڑ لیا۔ کثرتِ مطالعہ سے ذہن میں خیالات کا جو تلاطم آتا اسے وہ صفحہء قرطاس پر بکھیر دیتے۔ مغربی ادب میں شروع ہی سے انھیں خاصی دلچسپی تھی۔ تالستائی کی 'اینا

کیرنیناں' دوستوویسکی کی 'بروکر وموزیو' شیخوف کی 'گریف' اور میلان کندیرا کی 'مارٹیلٹی' وغیر پر مشتمل پسندیدہ کتب کے مطالعے سے تخلیقی ذہن کی تشنگی نے انھیں مزید بے سکون کر دیا جس کا حل انھیں جدید علوم سے آشنا لوگوں سے میل جول بڑھانے میں ہی نظر آیا۔ چنانچہ کارنیل یونیورسٹی امریکہ میں کمیونی کیشن آرٹ میں داخلے کی منظوری کے ساتھ ہی وہ امریکہ کے لیے عازمِ سفر ہو گئے۔

کارنیل یونی ورسٹی میں داخلے سے اپنی سوچ کی وسعت اور علم میں قابلِ قدر اضافہ تسلیم کرتے ہوئے دیویندر اسّر کہتے ہیں:"اسی بہانے فرانس، اٹلی، ڈنمارک، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، انگلینڈ اور ایران بھی گھوم لیا۔ میری شخصیت کا پیراڈائم شفٹ ہو گیا۔(۱۸) اس علمی ادبی مثبت توانا ماحول میں کارنیل یونی ورسٹی کی جانب سے دیویندر اسّر کو ۱۹۷۴ء میں محض ماسٹر ان کمیونی کیشن آرٹس کی ڈگری ہی تفویض نہیں ہوئی بلکہ یونی ورسٹی کے جاندار علمی ماحول میں ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات میں وسعت اور ادبی شخصیت میں نکھار آجانے سے ان کے فکر و فہم اور تخلیق کا دائرہ کار بھی وسعت پذیر ہوتا چلا گیا۔ عام طور پر مغربی طرزِ زندگی اور جدید طرز فکر کی ہمارے یہاں بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے لیکن دیویندر اسّر کے ساتھ معاملہ کچھ الٹ ہی پیش آیا۔ امریکہ سے واپس آکر جب انھوں نے ادب کا قبلہ درست کرنے کی ٹھانی تو یہاں کی ادبی دنیا بیرونی ترقی اور نئے افکار سے بالکل ہی بے خبر نکلی۔ اس پر طرّہ یہ کہ یہاں کے جمود کے قائل ادیبوں کا جدید زمانے کے نئے افکار سے کچھ لینا دینا ہی نہیں تھا۔ دیویندر اسّر شروع شروع میں تو بھینس کے آگے بین بجاتے رہے لیکن کوئی مثبت ردّ عمل سامنے نہ آنے پر وہ جملہ ادبی گروہوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ شومئ قسمت سے ادبی ماحول کی عدم دلچسپی سے بھی بڑا صدمہ انھیں اپنے بدلے ہوئے گھریلو ماحول کی وجہ سے بھی اٹھانا پڑا۔ تاہم دیویندر اسّر نے گھریلو بے گانگی اور تنہائی کا ماحول اپنے اوپر مسلط کرنے کی بجائے افکار و خیالات مجتمع کرتے ہوئے 'مستقبل کے روبرو' جیسا تنقیدی شاہکار دنیائے ادب کے سامنے پیش کر دیا۔ لیکن اس کے برعکس ان کا گھر مکینوں کی نفرت کے بھنور میں ڈوب کر گھر کی بجائے پھر سے مکان میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جب وہ گھر داخل ہوتے تو گلے میں کچھ اٹکا اٹکا محسوس ہوتا۔ ڈاکٹر انھیں دمے کی دوائیاں تھما دیتے مگر انھیں تن بدن کی بجائے من کی بیماری لاحق تھی۔ اکھڑ مزاج اور ہٹ چھٹ بیگم سے شادی کی ۲۵ سالہ رفاقت عدالت میں طلاق پر منتج ہو گئی۔

۲۷ سالہ ملازمت سے ۱۳ اگست ۱۹۶۸ء کو سبکدوشی کے بعد دیویندر اسّر نے عمر کا آخری حصہ اپنوں کے بیچ بطور اجنبی اور انتہائی گوشہ نشینی کے عالم میں گزارا۔ اپنے ہاتھوں سے بنائے گھر کے پچھواڑے میں پانچ سات کے کمرے میں رکھا تخت پوش ہی ان کا سٹڈی ٹیبل اور بیڈ بھی تھا جس کے کنارے اخبارات و رسائل دھرے ہوتے۔ گوشہ نشینی کے ان تکلیف دہ حالات میں بھی وہ جسمانی مرض کے قرض کا سود تخلیقی عمل میں منہمک ہو کر ادا کرتے رہتے۔ کتاب ہی نے انھیں سب کچھ دیا تھا اس لیے وہ کتاب ہی کو ابدیت کا وسیلہ مان کر عمر کے آخری حصے میں کتاب ہی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ کثرتِ مطالعہ کے باعث تھکن سے چور وہ بستر پر دراز ہوئے بھی بند آنکھوں سے افکار کے قیمتی موتی چنتے اور انھیں صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہوئے اپنی تخلیقات کی فہرست طویل تر کرتے چلے گئے۔

شخصیت و افکار:

دیویندر اسّر کی شخصیت پر ان کے ہم عصروں کے ذیل کے تبصرے ان کی شخصیت کا بھرپور خاکہ پیش کرتے ہیں :

''وہ سپنوں کی پرچھائیوں کے پیچھے بھاگنے والے، اپنے کرداروں کو کتھا کے بیچوں بیچ غائب کر دینے والے اندھیروں، حصاروں، اشاروں، غیر معمولی افعال، ان گنت سمتوں، تجریدی جہتوں، روحانی پروازوں، آزاد خیالی کے ہر احساس کو، پرندوں، بادلوں، خوشبوؤں تک کو پکڑ لینے کا حوصلہ رکھنے والے شخص ادیب ہیں۔ خوشبو ان کا مطلوبہ استعارہ ہے۔ اچیاں کنداں ڈک نہ سکن، پھلاں دی خوشبو''(۱۹)

پیدائشی وطن کو خیر باد کہنے کے بعد جنم بھومی کی یاد کی کسک، راہِ ہجر کی صعوبتوں کی برداشت اور پھر نئے وطن میں اپنی جڑیں پھر سے مضبوط کرنے کے دشوار مراحل طے کرتے ہوئے بھی دیویندر اسّر کو شدید کرب کا سامنا رہا لیکن اس کربناک صورتحال کے باوجود بھی وہ بطور ادیب اپنے قاری سے افکار و خیالات کا رشتہ مضبوطی سے استوار کرنے میں کامیاب رہے۔ دیویندر اسّر کے ہاں جدید ادبی نظریات کے مطالعے کے نتیجے میں ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے اثرات کا امتزاج سمٹ آیا جس کی واضح مثالیں قاری کو ان کے افسانوی مجموعے 'پرندے اب کیوں نہیں اڑتے' اور ناولٹ 'خوشبو بن کے لوٹیں گے' میں جابجا بکھری نظر آتی ہیں۔ پاک و ہند کے خمیر سے تعلق کے ناطے دیویندر اسّر کو پنجابی ہندی اور اردو پر مکمل عبور حاصل تھا۔ ساتھ ہی انگریزی زبان کے گہرے مطالعے سے ان کی تخلیقات میں مغربی افکار کی گہرائی اور گیرائی ملتی ہیں۔ یوں بھی چار زبانوں کے ورتارے کا یکجا ہونا برّصغیر کے بہت کم ادیبوں کے ہاں ملتا ہے۔ مغربی ادب میں دیویندر اسّر کی گہری دلچسپی کا ثبوت جگدیش چترویدی کے اس بیان سے بھی ملتا ہے:

''کبھی ہاتھ میں کافکا کی ڈائری ہوتی تو کبھی سارتر کے ناول اور کبھی کامیو کی خود نوشت۔ مغربی مفکروں میں ان کی گہری دلچسپی تھی اور کافکا کہیں گہرے ان کے دل سے جڑے ہوئے تھے وہ مجھے برٹرینڈ رسل سے لے کر بیٹنک شعرا تک کی نئی نئی تخلیقات کی جانکاری دیتے تھے۔ ہم لوگ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نطشے، کرکے گارڈ اور بیٹ شعرا کی تخلیقات پڑھتے رہتے تھے۔ مجھے ابھی بھی یاد ہے کہ 'کیس بک آف دی بیٹس' مجموعہ جب میں امریکن لائبریری سے بہت کوشش کے بعد لانے میں کامیاب ہوا تھا تو دیویندر اسّر اور شیام پرمار، نے بھی اسے پڑھا تھا۔''(۲۰)

دیویندر اسّر اپنی ادبی زندگی تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ کالج کے زمانے میں ادب سے اپنی شروعاتی کشش کو پہلا دور گردانتے ہیں جب ان کی دلی خواہش ہوتی کہ ان کا لکھا ہوا کہیں بھی چھپ جائے۔ دوسرا ادبی دور وہ تھا جب ان کی خواہش ہوتی کہ وقت کے نامور ادیبوں کے ساتھ مشہور اور معیاری رسائل و جرائد میں ان کی ادبی کاوش اشاعت پذیر ہو جبکہ تیسرے اور آخری دور میں وہ محض اپنے فکری مضامین کی تخلیق و اشاعت کو ہی اہمیت دینے لگے۔ کمیونزم اور ادبی گروپوں سے کنارہ کشی کے بعد انھیں رومانس پر مبنی ادب بھی پسند آنے لگا تھا:

”کوئی بھی شخص رومانی مزاج کے بغیر خواب نہیں دیکھ سکتا۔ نہ ماضی کی یادوں میں کھو سکتا ہے اور نہ ہی مستقبل میں خوشبو لے کر داخل ہو سکتا ہے۔ یہ رومانی مزاج ہے کیا؟ چیزوں سے پرے اور پار دیکھنا یہ مسئلہ مزاج کا ہے حسن کا ،اقدار کا ہے۔ دنیا کی ہر بڑی تبدیلی سپنے سے شروع ہوتی ہے۔ جو سپنے نہیں دیکھتے ان کے پاس یادیں بھی نہیں ہیں، صرف حقیقت ہے یاد اور سپنے کے بیچ جو وقفہ (اسپیس) رہ جاتا ہے تخلیق کا بیج اس میں جنم لیتا ہے اور اس طرح حال کو ماضی سے اور ماضی کو مستقبل سے جوڑ دیتا ہے۔“(۲۱)

وفات:

دیویندر اسّر عمر بھر ملکوں ملکوں اور شہر در شہر مسلسل ہجرتوں کے مراحل طے کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی داخلی ہجرتوں کا کربناک عذاب بھی جھیلتے رہے۔ پاکستان میں بچپن ہی میں ماں کی جدائی کا گہرا صدمہ برداشت کرنے کے بعد دہلی میں بیوی سے مستقل جدائی کا صدمہ پیش آیا۔ میاں بیوی کی آپس میں علیحدگی ،دیویندر اسّر کے لیے ماں سے جدائی کے بعد داخلی کرب کی دوسری مثال تھی۔ اولاد کی جانب سے عدم توجہ ،بیوفائی اور کسی کام نہ آنا بھی داخلی کرب کی ٹیسوں نے انھیں توڑ کر رکھ دیا تھا اسی لیے عمر کے آخری حصے میں وہ کتابوں کی صحبت میں گوشہ نشین ہو کر رہ گئے۔ بیٹوں کے جانب سے ملاقات کے لیے آنے والوں سے انتہائی گستاخانہ روّیے نے دیویندر اسّر کے دوستوں کو بھی بد دل کر دیا تھا۔ اس لیے کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہو پائی کہ ان کی موت کیونکر واقع ہوئی جو ہندوستان میں اردو کے سب سے زیادہ باخبر، کثیر التصانیف مگر خلوت گزیں ادیب کی زندگی کا تلخ اور ناقابلِ یقین ڈراپ سین بھی تھا۔ دیویندر اسّر کی اپنی موت بھی ان کے متعدد افسانوی کرداروں کی موت کی طرح سوالیہ نشان بن کر رہ گئی۔ جس طرح وہ اپنے کرداروں کی موت کے بارے میں اکثر سوالات کھڑے کر دیا کرتے تھے اسی طرح دیویندر اسّر کے احباب بھی یہ گتھی سلجھانے میں ناکام ہی نظر آئے کہ دیویندر اسّر کی موت کیونکر اور کس ہسپتال میں واقع ہوئی اور یہ کہ اگر انھوں نے گھر پر ہی دم توڑا تھا تو خاندان کا کوئی فرد موت کے وقت قریب موجود بھی تھا کہ نہیں۔ دیویندر اسّر نے ہجرتوں کے تسلسل میں سب سے پہلے حسن ابدال، پاکستان سے کیمبل پور ہجرت کی اور پھر کیمبل پور سے کانپور بھارت، پھر کانپور سے دھلی آکر کچھ ٹک تو گئے مگر داخلی ہجرتوں کی یلغار نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اپنوں کی بے گانگی اور داخلی کرب کی کسک میں مبتلا یہ شخص اپنے دوستوں عزیزوں کو بنا کچھ بتائے خاموشی سے ۶ نومبر ۲۰۱۲ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ نند کشور وکرم، دیویندر اسرّ کے تلخابہء حیات کا آخری ورق سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیویندر اسّر کے دونوں بیٹوں نے رہائش گاہ کے عقبی دروازے کی گھنٹی جان بوجھ کر خراب کر دی تھی تا کہ ان سے ملنے کے لیے آنے والا گھنٹی ہی نہ بجا پائے۔ دیویندر اسّر سے متعلق دماغ میں پیدا ہونے والے منفی خدشات کے سبب جب انھوں نے گھر کا عقبی دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا تو ان کے بڑے بیٹے نے انتہائی رعونت سے مین گیٹ پر آنے کا کہا۔ تالا لگا مین گیٹ کھولے بغیر ہی آنے سے متعلق استفسار کے جواب میں نند کشور وکرم کا جواب تھا:

”میں اسّر صاحب کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے دروازہ نہیں کھولا اور جواب دیا کہ ان کی تو وفات ہو چکی ہے۔ مجھے کرنٹ سا لگا اور احساس ہوا کہ جیسے کسی نے مجھ پہ گولی داغ دی ہو' مگر تم نے اطلاع کیوں نہیں دی؟' کیوں اطلاع دیتا، آپ کیا ہمارے رشتہ دار لگتے ہیں؟ اب میں اسے کیا جواب دیتا کہ میرا اسّر صاحب سے کیا رشتہ ہے۔“ (۲۲)

نند کشور وکرم، دیویندر اسّر کے بیٹے کی تلخ باتیں محض اپنے دوست کی تاریخ رحلت کی تصدیق کے لیے برداشت کرتے رہے۔ نند کشور وکرم اس ملاقات کی مزید تفصیل ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

”میں حیران پریشان اس کی صورت دیکھنے لگا کہ وہ شخص جس سے میرا بھائیوں کی طرح رشتہ تھا۔ مجھے اس کی موت کی خبر تک نہیں دی گئی۔ میں اندر سے غصے سے کھول اٹھتا ہوں پھر بڑے صبر و تحمل سے سوال کرتا ہوں 'کب؟' ٦ نومبر کو اس نے کرختگی سے جواب دیا۔“ (۲۳)

البتہ حیدر قریشی دیویندر اسّر کی موت پر دل کو کچھ یوں تسلی دیتے نظر آئے:

”مجھے لگتا ہے کہ موت کی صورت میں اپنی زندگی کی آخری ہجرت کے بعد دیویندر اسّر اب اپنی ماں کے قدموں کی سورگ میں بیٹھے، زندگی بھر کی تھکن اتار رہے ہوں گے۔“ (۲۴)

حوالہ جات:

۱۔ دیویندر اسّر: خوشبو بن کے لوٹیں گے؛ پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دھلی؛ ۱۹۹۳ء، ص۹۷۔

۲۔ ایضاً: ص ۱۲۔

۳۔ نند کشور وکرم: ایک دانشور، ایک مفکر۔ دیویندر اسّر؛ ایضاً، ۲۰۱۳ء، ص۹۷۔

۴۔ دیویندر اسّر: خوشبو بن کے لوٹیں گے؛ ایضاً، ص ۱۳۔

۵۔ دیویندر اسّر: ایک زمانہ بیت گیا؛ مشمولہ چہار سو، ایضاً، ص٦۔

٦۔ ایضاً: دل کی بستی مشمولہ مشعل؛ ایضاً، ص۲۰۹۔

۷۔ شیخ محمد افضل سے انٹرویو: از راشد علی زئی، دسمبر ۲۰۱۸ء۔

۸۔ ایضاً: باتیں ہماریاں؛ مشعل گولڈن جوبلی نمبر ایضاً، ص۲۲۷۔

۹۔ دیویندر اسّر: خوشبو بن کے لوٹیں گے؛ مشمولہ عالمی اردو ادب۔ دیویندر اسّر نمبر، کرشن نگر، دہلی، ۱۹۵۵ء، ص۵۰۔

۱۰۔ گورچرن سنگھ: پتھروں کے شہر میں شیشہ گر؛ مشمولہ ایک دانشور، ایک مفکّر۔ دیویندر اسّر، ایضاً، ص۱۱۹۔

۱۱۔ ابن النصیر: عالمی اردو ادب؛ دیویندر اسّر نمبر، ایضاً، ص۲۷۔

۱۲۔ حیدر قریشی: عالمی اردو ادب؛ ایضاً، ص۳۰۔

۱۳۔ کمل کمار: دیویندر جی خوشبو بن کے لوٹ آئے؛ مشمولہ ایک دانشور ایک مفکر۔ دیویندر اسّر، ایضاً، ص۲٦۔

۱۴۔ گلزار جاوید: دیویندر اسّر سے مکالمہ بعنوان براہ راست؛ ایضاً، ص ۱۰۔

۱۵۔ دیویندر اسّر: خوشبو بن کے لوٹیں گے؛ ایضاً ص ۱۵۔

۱۶۔ ایضاً؛ ص ۸۵۔

۱۷۔ عمران عراقی: دیویندر اسّر مستقبل کے روبرو؛ ایجوکیشنل بکس ہاوس، دہلی، ۲۰۱۷، ص ۴۹۔

۱۸۔ دیویندر اسّر: ایک زمانہ بیت گیا؛ چہار سو، ایضاً، ص ۸۔

۱۹۔ ہریش نول: نہ دکھنے والا درد؛ مشمولہ ایضاً، ص ۹۳۔

۲۰۔ جگدیش چترویدی: تشکیک کے بیچ جیتے ہوئے لوگ؛ مشمولہ ایک دانشور، ایک مفکر۔ دیویندر اسّر، ایضاً، ص ۲۶۔

۲۱۔ راجی سیٹھ: دیویندر اسر؛ ایک جلاوطن کی شاعری، ایضاً، ص ۱۶۰۔

۲۲۔ نند کشور وکرم: اک دانشور کی موت؛ ایضاً، ص ۱۲۔

۲۳۔ نند کشور وکرم: ایضاً، ص ۱۲۔

۲۴۔ حیدر قریشی: دیویندر اسّر کی آخری ہجرت؛ ایضاً، ص ۳۵۔

☆☆☆☆☆